بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

کچھ مجبورانہ حالات ہیں کہ جن کو بیان کیا جائے تو پھر بھی دوسروں کی سمجھ میں آنا مشکل! — ان کی وجہ سے میں بعض مشاغل کی انجام دہی سے بہ صد شرمساری قاصر رہتا ہوں۔ ایک آدمی جسے اوّل روز سے اپنے عقیدہ و مقصد کے لیے کئی کئی کام کرنے کی دُھن رہی ہو اور کسی خارجی تحریک یا تحسین یا افادیت کے بغیر جس کے دل و دماغ کی قوتیں محض ایمان و ضمیر کے زیرِ اثر جادۂ فرض پر رواں دواں رہی ہوں اور اب بھی بڑی حد تک ہوں، وہ اگر عمر و صحت کے دورِ رفتہ کے معیار و مقدار سے کام نہ کر پائے تو پھر بھی اتنا تو ہے کہ ایک آدمی کو اوسط درجے کا جتنا کام کرنا چاہیے اس سے کچھ زیادہ ہی کرنے کی توفیق اللہ تعالیٰ نے دے رکھی ہے۔ تاہم درپیش حالات کے تحت میں نے سفر کرنے اور تقاریر کا سلسلہ ضرور چھوڑا ہے۔ کچھ عرصے تک میں منصورہ کی تربیت گاہوں میں کوئی نہ کوئی پروگرام لیتا رہا، مگر اب اس بارے میں بھی بات معذرت پر آگئی ہے۔ اس محرومی کو میں خود بہ شدت محسوس کرتا ہوں، مگر مجبورانہ حالات کا کیا علاج!

تاہم اس مرتبہ کی (وسط نومبر) تربیت گاہ میں جب سلطان احمد صاحب عاصم نعمانی ناظمِ تربیت گاہ نے بہ اصرار ایک پروگرام رکھ دیا تو میں نے اس استثنائی صورت فرمائش پر مناسب یہی سمجھا کہ امتثالِ امر ہو جائے۔ سو چند باتیں شرکائے تربیت گاہ سے کی گئیں۔ خیال ہوا کہ ان کو ترجمان کے ادارتی صفحات میں پیش کر دیا جائے تاکہ چھوٹے سے ہال میں جو آواز اُٹھائی گئی تھی، وہ ذرا وسیع تر فضاؤں میں پھیل جائے۔

پہلی بات میں نے یہ کہی کہ آپ کا مرکزی اور بنیادی فریضہ دعوتِ حق ہے جس کے متعلق قرآن میں آیا کہ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ، تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آلِ عمران - ۱۱۰) یعنی خیر اُمت اور اُمتِ وسط اور مرکزی گروہ ہونے کا اعزاز صرف اس امر پر منحصر ہے کہ آپ لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کریں۔ یعنی نیکی کو دوسروں تک پھیلائیں اور اسے غالب کرنے کی سعی کریں۔ اور برائی سے لوگوں کو بچنے کی اور اس کے اثر و تسلط کو ختم کرنے کی کوشش کریں۔ یہ دعوت بیج ہے پورے نظامِ اسلامی کا۔ اور یہ دعوت دورِ کش مکش سے بھی گزارتی ہے، ہجرت کی وادیاں بھی طے کراتی ہے، جنگ کے میدان میں بھی لے جاتی ہے تاکہ نیکی اور سچائی کے غلبے کی مزاحمت کرنے والی فاسد قوتوں کو تلوار کے زور سے راستے سے ہٹا دیا جائے۔ گویا دعوت خود بھی ایک طرح کا جہاد ہے اور آگے یہ جہاد کے مختلف مراحل سے گزار کر کامل جہاد، یعنی قتال تک پہنچاتی ہے۔

دعوتِ حق کی ذمہ داری ہلکی اور آسان نہیں ہے۔ ہر قسم اور ہر سطح کے لوگوں تک، ان کی زبان اور ان کے مروج اسالیب کے مطابق اس کو پہنچانا اور ابلاغ کے جو جو بھی پاکیزہ ذرائع حاصل ہوں ان سے کام لینا ہے۔ یعنی دعوت بذریعہ صحافت، دعوت بذریعہ ادب، دعوت بذریعہ علوم، دعوت بذریعہ تعلیم، دعوت بذریعہ تصانیف، دعوت بذریعہ وسائلِ نشر و اشاعت، دعوت بذریعہ اجتماعات، دعوت بذریعہ مظاہرات، دعوت بذریعہ اُمورِ سیاسیہ، دعوت بہ دائرہ انتخابات، دعوت بہ حلقہ پارلیمان، غرضیکہ ہر سطح پر اور ہر وسیلے سے بھرپور کام کرنا مطلوبِ دین ہے۔

یہ سرسری ذمہ داری نہیں ہے بلکہ اس کے لیے تنبیہ و تاکید اتنے سخت انداز سے کی گئی ہے کہ یہ نہیں تو گویا کچھ بھی نہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بروایت ترمذی قسم کھا کر فرمایا کہ "تم کو لازمی طور پر معروف کا حکم دینا ہوگا۔ اور لازمی طور پر منکر سے روکنا ہوگا، ورنہ ایسا ہونے کا شدید اندیشہ ہے کہ اللہ تم پر سخت مصیبت نازل کرے، پھر تم اُسے پکارو اور تمہاری پکار نہ سنی جائے"۔

جو لوگ اقامتِ دین میں دیر لگتے دیکھ کر پریشان ہو جاتے ہیں اُن کو جاننا چاہیے کہ حصولِ مقصد کا دارومدار اس کے مقرر کردہ طریق سعیِ دعوت پر ہے۔ اگر آپ دعوت کو پھیلا کر زیادہ سے زیادہ لوگوں کو، جلد سے جلد متاثر کر لیں تو غلبۂ دین بھی جلد ہوگا۔ اگر آپ کی رفتارِ دعوت سست ہوگی تو

غلبۂ دین میں بھی دیر لگے گی۔ انتخابات میں بھی کوئی نتیجہ نکل سکتا ہے تو دعوت کے متاثرین کی کثرت سے نکل سکتا ہے اور انقلاب بھی واقع ہو سکتا ہے تو عوامی قوت کے جمع ہونے سے واقع ہو سکتا ہے۔ ہم لوگ انتخابی اور پارلیمانی سرگرمیوں کو زندگی کے مختلف دائروں کی طرح اثر اندازی اور توسیعِ دعوت کا میدان سمجھتے ہیں۔ نقطۂ نظر ہمارا بھی یہی ہے کہ آخری عمل انقلابی ہوگا۔ بلکہ دعوت، اس کا پورا عمل اور اس کے جملہ مراحل سب کے سب انقلابی نوعیت کے ہیں۔

عرض کیا گیا کہ یہ بات بھی ذہن میں تازہ رکھیے کہ دعوتِ حق کا سب سے پہلا مخاطب داعی خود ہوتا ہے۔ اگر کوئی دعوت داعی کے اندر اُتر کر اس کے تمام اقوال و افعال، لین دین، رشتوں اور دوستوں، دلچسپیوں اور عادتوں پر اثر انداز نہ ہو تو پھر وہ محض ایک ریاکارانہ وعظ ہے، جس کا کبھی گہرا اثر نہیں ہوتا۔ دوسری بات یہ کہ آدمی کے لیے اوّلین دائرۂ کار اس کا گھر ہے۔ گھر کے لوگوں تک دعوت کو پہنچانا، اُن کو معروف کے لیے تاکید کرنا اور منکر سے روکنا بروئے قرآن بھی ضروری ہے اور حضورؐ کا اپنا اُسوہ بھی یہی ہے، داعی اگر اپنے گھر ہی میں وزن نہ پا سکے تو باہر زیادہ مشکل ہوگی۔ بعد ازاں بہت سے دوسرے وسیع تر دائرے آتے ہیں۔

ایک بات یہ بھی بیان کی گئی کہ دعوت کے بہت سے طریقوں میں سب سے اہم چیز انسانی رابطہ ہے۔ آپ اگر لوگوں سے ملاقاتیں کریں، انہیں اپنے ہاں بُلائیں، گھنٹہ دو گھنٹہ بات کریں۔ ذاتی مسئلوں سے عالمی مسئلوں تک مِل کر غور کریں۔ اور کسی مناسب مرحلے پر دعوت کا مؤثر راستہ بنائیں تو یہ بہترین صورت ہے۔ محض چلتے چلتے بات کر دینا یا کوئی پمفلٹ پھینک جانا یا محض جلسوں میں اپنے اسٹیج سے حسبِ دلخواہ باتیں سُنا لینا اتنا زیادہ کارگر نہیں ہے۔ آپ لوگ تجربہ کے طور پر دو دو چار چار افراد کے وفد بنا کر ہفتے میں ایک دو بار آس پاس کے دیہات یا آبادیوں میں نکلیں، کبھی دیہی بستیوں کے درمیان یک روزہ، دو روزہ یا سہ روزہ کیمپ لگا کر چاروں طرف پارٹیاں روانہ کریں۔ اِن تجربوں سے آپ کو نئے راستے ملیں گے اور نیا اعتماد حاصل ہوگا۔

دوسرا مسئلہ ایک پرانے تحریکی خادم کی حیثیت سے ان کے سامنے یہ رکھا کہ بیت المال چاہے وہ دو چار، دس روپے تک ہی محدود ہو، کسی گاؤں یا تحصیل یا ضلع کا ہو یا صوبہ یا مرکز کا، یا خدائی

اور خدمتی کاموں کے لیے کوئی امانتی فنڈ آپ کی تحویل میں ہو تو اس کے بارے میں حد درجہ محتاط رہیں۔ کیونکہ اس کی نزاکت مالِ یتیم کی سی ہے۔ اس میں سے خرچ کریں تو بے جا طور پر اور غیر ضروری طور پر ایک پیسہ بھی زائد خرچ نہ ہونے دیں۔ اپنے مفاد کے لیے اس میں سے اپنے حق سے زیادہ نہ نچوڑیں۔ ایسی تنخواہیں اور ایسے مصارف نہ لیں جو اسلامی قواعد کے لحاظ سے حدِ جواز سے زیادہ ہوں — بیت المال کے معاوضوں کے بل پر اپنے عزیزوں کو فائدے نہ پہنچائیں۔ اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کو بھرتی نہ کریں، خود فیصلہ کرنے کے بجائے کسی انصاف پسند اور بے لحاظ بورڈ کو تقریروں اور برطرفیوں پر مقرر کریں۔ جس مقصد سے کوئی آدمی لینا ہو، اس کے لیے درخواستیں طلب کیجیے اور قابلیت وصلاحیت وتجربہ اور تحریکی شعور واخلاق جدھر زیادہ ہو اُدھر نگاہِ انتخاب اُٹھائیے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے فرزند کو دائرہ استحقاقِ خلافت سے باہر رکھ کر جو درخشاں روایت قائم کی تھی اور جسے بعد میں امیر معاویہؓ نے یزید کو جانشین مقرر کر کے توڑا تھا۔ اس روایت کو آپ حضرت عمرؓ کی تقلید میں از سرِ نو قائم ومضبوط کیجیے۔ بیت المال کا ایک پیسہ بھی جو ناجائز طور پر خرچ کیا گیا یا اعزہ پروری کے لیے استعمال کیا گیا۔ وہ خدانخواستہ کسی ذمہ دار شخص کو جہنم کی سیر کرا سکتا ہے۔ اسی ضمن میں بیت المال یا کسی نیک کام کے فنڈ کی ملکیتی اشیاء کے استعمال کا معاملہ ہے۔ اُدھر کے سامان اور سٹیشنری کو ذاتی استعمال میں لانا درست نہیں۔ گاڑی یا ٹیلیفون استعمال کرنا پڑے تو اُس کا معاوضہ ادا کریں۔ بیت المال کی کوئی چیز اگر ذاتی قبضے میں رکھی گئی ہو تو اس کا ذاتی اور گھریلو استعمال ہرگز نہ کریں۔ اگر بیت المال کے دفتر کا کمرہ آپ کے پاس ہو یا کوئی مکان یا کسی طرح کی فٹنگ تو ساری چیزوں کا استعمال بہترین اسلوب سے کریں۔ اور انہیں ہر نقصان سے بچائیں۔ لاپروائی سے خدائی امانت کا استعمال آخرت کے لیے باعثِ نقصان ہو سکتا ہے۔

خدارا اپنے آپ کو اس خطرے سے بچائیے اور اپنے ساتھیوں کو بھی باز رہنے میں مدد دیجیے۔

مالی معاملات میں ہمارے نقطۂ نظر پر بہت سا اثر ہمارے ماحول کا ہے اور اس کے چوطرفہ دباؤ کا مقابلہ کرتے کرتے ہم بار بار جیب تھک ہار جاتے ہیں۔ اس صورت میں دنیا اور دولت اور معیارِ زندگی کی

کشش ہمیں اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ ہر آدمی کو کوٹھی چاہیے، کار چاہیے، قالین چاہئیں، صوفے چاہئیں کراکری چاہیے، شاندار لباس چاہیے، جدید آسائشیں چاہئیں، شاندار تقریبات چاہئیں — اور جماعت کے اندر کا ہر آدمی بھی ہزار پرہیز کے باوجود دوہرا دوہرا وقت صرف کرکے اور خاندان کے کئی افراد کی محنتیں جمع کرکے دن رات اپنے منصوبے کو پورا کرنے میں لگا رہتا ہے، ورنہ بچوں کی تعلیم مشکل ہے، ان کے رشتے لینا دینا مشکل ہے، نتیجہ یہ کہ اوّل تو ذہنی مصروفیت تحریک سے زیادہ دوسری جانب ہے اور دوسرے یہ کہ آمدنیوں اور مصارف میں زیادہ سے زیادہ کے لیے جواز تلاش کرنے کا رجحان کام کرتا ہے۔ اور تو اور بعض لوگ تنافس کی فضا پیدا کرنے کا باعث اس طرح بنتے ہیں کہ ایک نیا شقلہ اُٹھا دیتے ہیں۔ بچوں کے کھیل کے نام سے قیمتی چیزیں لاکے محلّے کے دوسرے بچوں کو بھی مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ اپنے والدین پر دباؤ ڈالیں۔ بجائے اس کے کہ ہمارے بچے خاندان اور محلے بھر میں خدمت کے کاموں اور عمارتوں، کیاریوں، پھولوں، نالیوں، پانی اور بجلی کے تحفظ کی صفات لے کے اُٹھتے، اُلٹا یوں لگتا ہے کہ وہ ایسے بچے ہیں جنہیں نہ والدین، نہ مکتب، نہ قریبی ماحول معاشرے کے مقابلے میں کوئی برتر اطوار نہیں دے سکا۔

ہمیں تو قرآن نے بھی فریبِ دُنیا سے بچنے اور دولت پرستی سے پرہیز کی تاکید تعلیم دی ہے اور حضور نبی اکرمؐ نے بھی سخت انتباہ دیئے۔ قرآن و حدیث کے احکام آپ پڑھتے سُنتے ہیں ہی۔ میں یہاں ایک ادیب کے خیالات بیان کرتا ہوں، جو تحریکِ اسلامی کا سپاہی نہ تھا اور نہ دعوتِ حق کا علمبردار، مگر بس ادب کے ذریعے سچائیاں سامنے لانے کا مشن رکھتا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ دُنیا پرستی اور سچا ادب ایک دوسرے کے ساتھ نہیں چل سکتے۔ میں مرحوم ادیب سے دوستی کے باوجود کئی پہلوؤں سے اس سے اختلاف رکھتا ہوں، مگر بعض باتوں کا قدردان ہوں جن میں سے ایک یہ ہے۔ ذرا سُنیے،

"آپ اپنے نفس میں خدا کو حاضر ناظر جان کر یا اپنے ضمیر کو گواہ بنا کر یہ فیصلہ کر لیں کہ آپ ادیب رہنا چاہتے ہیں کہ نہیں؟ اور اگر ادیب رہنا چاہتے ہیں تو پھر اپنے زمانے کی سچائیوں کو بے نقاب کریں۔ اور اپنے نفس اور معاشرے کے بدلے میں سچائی سے کام لیں، خواہ اس کی کوئی بھی قیمت دینی پڑے۔ ادب کی تخلیق لفظوں کی تجارت نہیں ہوتی — تخلیق ایک طرزِ زندگی ہے۔ یہ ادیبوں، درویشوں، صوفیوں، انقلابیوں اور پاگلوں کا

کام ہے۔ اس میں زر پرست، سماجی ریاکار، منافق، ہاتھی دانت رکھنے والے معلم شامل نہیں ہو سکتے۔"

"ادیب کے لیے ایک مخصوص معنوں میں تارک الدنیا ہونا لازمی ہے۔ آپ ادیب بننے کی تمنا اور افسر بننے کی تمنا، اور کوٹھی اور کار کی تمنا اور بنک بیلنس کی تمنا، اور سب سے خوشگوار تعلقات رکھنے کی تمنا کو ایک سینے میں جمع نہیں کر سکتے۔"

"سوال یہ ہے کہ تم معاشرے کو اپنی شرائط پر قبول کرنا چاہتے ہو، یا معاشرے کو اس کی شرائط پر ملنے کے لیے تیار ہو، معاشرہ تمہیں سب کچھ دینے کے لیے تیار ہے اور دے سکتا ہے، مگر اس کے لیے تمہیں اس کے شرط نامے پر دستخط کرنے ہوں گے۔"

"ادب کو میں نے کبھی صرف لکھنا لکھانا نہیں سمجھا، ادب ایک طرز حیات ہے اور اپنی تکمیل کے لیے صوفیوں جیسی ریاضتوں اور مجاہدوں کا طالب ہے۔ زندگی میں کامیابی کا راستہ، ادب کا راستہ نہیں ہے۔ یہ دو مختلف منزلیں ہیں اور دونوں کے راستے جدا جدا ہیں اور دونوں کے درمیان میں انتخاب کا مسئلہ ہے۔ بہت سے لوگوں نے ادب کو طرز حیات بنانے کے بجائے کاروبار بنایا اور اس میں کامیاب ہوئے تم بھی ایسے ادیب بننا چاہو تو شوکت صدیقی جیسے لوگوں کی پیروی کرو۔"

"میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آڈن کے الفاظ میں ادیب کو کوئی ایسا چھوٹا موٹا پیشہ اختیار کرنا چاہیے، جو اس کا زیادہ وقت نہ لے اور جس کے ذریعے وہ معاشرے میں عزت کی ایک متوسط زندگی گذار سکے۔ اسے نہ اتنا آرام ہو کہ سو جائے اور نہ اتنی تکلیف کہ سوچنا بھی مشکل ہو جائے۔"

ان اقتباسات میں سے لکھنے اور ادب اور تخلیق کے الفاظ نکال کر تحریک اسلامی اور دعوت اسلامی کے الفاظ رکھ دیجیے، اور پھر اس معیار پر سوچیے کہ سچی روح خدا پرستی کے ساتھ آخرت کے لیے کام کرنے والے ہم لوگوں میں دولت اور دنیا کے بارے میں ویسا احساس تقویٰ موجود ہے جیسا کہ ادیب کے ہاں پایا جاتا ہے؟ ہم لوگ ہر اس چیز اور لذت کو حاصل کرنے کے درپے ہیں۔ اور ہر اس رسم کو پورا کرنے میں لگے ہیں جو معاشرے میں رائج ہے۔ خون پسینہ ایک کر کے اور تحریک کا نقصان کر کے ہم

"دنیا" کا وہ پورا معیار حاصل نہیں کر سکتے، لہٰذا کچھ ناقابلِ عمل حسرتیں بھی ہمارے ذہنوں میں کنکھجورو کی طرح اپنے ہزار پا گاڑے ہوئے ہیں۔ سادہ زندگی کی کوئی لکیر ہم اپنے لیے نہ کھینچ سکے کہ یہاں تک جا کر لازماً رُک جانا ہے۔ کچھ چیزوں اور رواجوں کے متعلق اپنے اُوپر یہ پابندی لگانا کہ ان کو ہمارے گھروں میں داخلہ نہیں مل سکتا۔ حتیٰ کہ مغرب کی ملحدانہ اور مادہ پرستانہ تہذیب جس سے ہماری اصل لڑائی ہے، اس کے شئون و اطوار بھی ہم تدریجاً قبول کر رہے ہیں۔ ہمارے لوگوں کو دیکھ کر یہ محسوس نہیں ہوتا کہ خدا کے یہ بندے کچھ ایسے بندے ہیں جنہوں نے ایک مقصدِ عظیم کے لیے اپنے آپ کو ایک صاف ستھری مگر درویشانہ زندگی میں محدود کر لیا ہے۔ "لاتحبوا الدنیا" کی پکار روز ہماری مسجدوں میں بلند ہوتی ہے، مگر دُنیا کی کونسی چیز یا اس کی کون سی مقدار ہے جس کے لیے ہمارے دروازے بند ہوں۔ مسلمان کے پاس زیادہ دولت آتی ہے تو وہ اس کے اخراجات کو بڑھانے کے بجائے اس کے جذبۂ انفاق کو بڑھاتی ہے اور انفاق ہی دولت پرستی اور حبِ دین کا واحد علاج ہے

پھر میں نے یہ عرض کیا کہ:

اسلام کے لیے صحیح شعور اور پاک صاف ضمیر کے ساتھ کام کرتے ہوئے تنظیمی عہدوں کے بارے میں خبردار رہیے۔ عہدوں کا حریص ہونا ایک مجرمانہ ذہن کا آئینہ دار ہے اور اس سے ذرا ہی کم درجہ اس کا ہے کہ آدمی کو جونہی کسی عہدے کے لیے بُلایا جائے فوراً اُدھر لپک جائے۔ گویا کہ حضرت پہلے سے منتظر بیٹھے تھے۔ اور مزید عہدے ملتے جائیں تو بصد شوق انہیں شرفِ قبولیت دیا جاتا رہے۔

تنظیمی اداروں کے دفتری نظاموں میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ غیر شعوری طور پر چند افراد ایک دوسرے کو عہدہ و مناصب اور صدارتوں اور ثالثیوں کے لیے تجویز کرنے لگتے ہیں اور نیچے کے لوگ بھی سمجھ لیتے ہیں کہ فلاں فلاں آدمی کو اہمیت دینی ہے۔

پھر اس بات سے بھی خبردار رہیے کہ عہدے کی ذرا سی قوت ہاتھ میں آتے ہی آدمی اُسے بے باکی

سے استعمال کرنے لگے۔ کسی کو اِدھر سے اُٹھا کر اُدھر پھینک دیا، کسی سے کوئی انتقام لے لیا، اور کبھی اپنے قریبی آدمی کے لیے عہدہ چاہا جگہ پیدا کر لی۔ اگر کوئی اعتراض اُٹھائے یا تنقید کرے تو اُس کا گلا دبا دیا، یا عہدہ کبھی اس کا کوئی مسئلہ سامنے آیا تو پھر سارا حساب لے لیا۔

یہ طریقے دُنیا دار لوگوں کے کاروباری اور ملازمانہ معاملات میں چلتے ہیں، مگر خدا پرستوں میں نہیں۔ آج وقت ہے کہ ہم بیت المال اور عہدوں کے متعلق ایسی کڑی روایات قائم کر دیں کہ بعد کی جس نسل کو ہم کام سونپیں وہ اُسے خراب تر کر دینے کے بجائے اور زیادہ بہتری اور پاکیزگی اور نیکی کی طرف لے جائے۔

پھر مختصراً ایک مسئلہ اور عرض کیا گیا۔

مَیں نے کہا کہ جس طرح میدانِ قتال میں (زحفاً من القتال) کسی شخص کے لیے پسپائی سخت ترین گناہ ہے اسی طرح دعوتِ حق پیش کرنے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی سیاسی اور تہذیبی کش مکش میں پسپائی نہایت معیوب اور تحریک کے لیے نقصان دہ ہے۔ جتنا مقام آپ علم، اخلاق، نظم وغیرہ میں حاصل کر چکے ہیں اس کو ضائع کر کے پیچھے چلے آنا نہایت مضر ہے۔ آپ کے اپنے ایمان وضمیر کے لیے بھی اور دوسرے ساتھیوں کے لیے بھی۔ ڈاڑھی نہ رکھنا اچھا نہیں، مگر رکھ کر منڈا دینا خود اپنے اُوپر، بچوں پر اور معاشرے پر دین کی تحقیر کا اثر ڈالنا ہے۔ نماز کے پابند آدمی کا تارکِ نماز ہو جانا، ایک عفیف الطبع فرد کا بدکاری کے اکھاڑے میں کُود جانا دوہری بُرائی رکھتا ہے۔

آپ اپنے اُوپر نگاہِ دل سے سوچیں کہ تحریک نے یا دینی شعور نے آپ کو ذہنی اور اخلاقی طور پر کس بلندی تک پہنچایا۔ اور پھر دیکھیں کہ پچھلے دس، بیس، تیس یا چالیس برس میں آپ بلند تر ہوتے چلے گئے یا کٹی ہوئی پتنگ کی طرح آہستہ آہستہ پستی کی طرف گرتے چلے گئے۔ میں نے ایسے لوگوں کو بھی دیکھا جنہوں نے بہت سے مسرفانہ طریقے چھوڑ کر سادہ گذر بسر اختیار کی اور زائد مال تحریک کو دینے لگے، مگر بعد میں اُن کی یہ کیفیت برقرار نہ رہی۔ ان کا رہن سہن اور خرچ اخراجات کا معیار بڑھتا چلا گیا اور خوئے انفاق کم ہوتی چلی گئی۔ بعض افراد ایسے دیکھے کہ انہوں نے مولانا مودودیؒ کی دی ہوئی تعلیمِ قرآن وحدیث کو پلّے باندھا اور موسیقی کا بہت شوق رکھنے کے باوجود اس سے کلیتہً مجتنب ہو گئے۔ مگر بعد میں وہی ہیں کہ گھنٹوں اُن کے گھروں میں موسیقی کا دریا بہتا رہتا ہے۔ پردے کے

معاملے میں بات چہرے کے پردے اور مکمل برقعے سے چلی اور مخالفانہ ماحول کی پروا نہ کرتے ہوئے پردہ داری کے اس شاندار معیار کو ہماری خواتین نے قائم کیا۔ بعد میں ماحول کا دباؤ جب بڑھنے لگا تو "چادر" کی بات چلی۔ میں نے محسوس کیا کہ اب پسپائی کا آغاز ہو گیا ہے۔ پہلے پہل چادر اس طرح اوڑھی جانے لگی کہ تمام جسم و لباس اور زینتیں مخفی ہو جائیں۔ پھر وہی چادر سکڑتی دیکھی، اور شلوار کا ایک طرف کا پورا حصہ دکھائی دیتا۔ پھر شلوار کے دونوں حصے پورے سامنے آنے لگے۔ چہرے پر چادر کے پلوؤں کو پکڑ کر زیادہ اچھی طرح جوڑ لیا جاتا تھا۔ اب ان پلوؤں میں فاصلہ ہونے لگا۔ اسی طرح باقاعدہ قومی لباس مقرر ہو جانے کے باوجود بھی پتلون پہننے والوں کا شوق جا بجا نمودار ہوتا ہے۔ کئی عورتیں اپنی پان سات سالہ بلکہ دس بارہ سالہ بچیوں کو بھی سکرٹ اور سایہ پہنا کر گویا یہ حسرت پوری کرتی ہیں کہ ہمیں تو یہ نصیب نہ ہوا، اب ہم بچوں کو اس لباس میں سجا سنورا دیکھ کر اطمینان حاصل کریں گے۔ میں نے چھوٹی لڑکیوں کو پینٹ پہنتے ہوئے بھی دیکھا۔ کھڑے ہو کر کھانے اور چائے پینے کا فیشن مغرب سے آیا تو بجائے اس کے کہ ہم لوگ مضبوطی سے اس کے سامنے حائل ہو جاتے کہ کم از کم ہمارے گھروں میں اجنبیوں اور ملحدوں کا ایجاد کردہ یہ تہذیبی طریقہ جگہ نہ پا سکے گا، ہم نے اس کے فوائد گنوانے شروع کر دیئے۔ حالانکہ نقصانات زیادہ ہیں۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جماعتِ اسلامی تو قائم ہی اس لیے ہوئی کہ ایک ایک دینی روایت، حکم، شعار، قدر کا تحفظ کرے۔ اگر خود جماعت ہی کے خیمے میں تہذیبِ نو کی چڑیلیں آ گھسیں تو پھر ہمارا کیا فائدہ؟

یہ باتیں میں نے تصنع سے نہیں بلکہ دل کے تقاضے سے کہیں۔ یہ میرے ضمیر کی آواز تھیں، اگر کسی کو ناپسند ہوئی ہوں تو معذرت خواہ ہوں کہ ان کے احساسات کو کوئی تکلیف کیوں پہنچی — لیکن کسی کو ناگواری ہو یا خوشی، ہر حال میں مجھے ایسی باتیں کہنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اگر میں یہ نہ کر سکوں تو میرا بہ حیثیت مسلمان اور رکن جماعتِ اسلامی، خادمِ اسلام اور نگہدارِ تحریک ہونا کتنا بے معنی ہوگا۔

یہ مرحلہ جبکہ تنظیم آہستہ آہستہ اگلی نسل کی طرف منتقل ہو رہی ہے، اس میں ضروری انتباہات سامنے آنے چاہئیں!